نصف صدی کی ہم سفری قاضی عبدالستار

ڈاکٹر مظفر حسین سید

29/11، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002، موبائل:9818827853

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

قاضی عبدالستار صاحب کی مراجعت جہان دگر صرف ایک قد آور ادیب وقلم کار کی رحلت نہیں، بلکہ ایک عہد کا اختتام ہے، ایک دور کا انجام بے خیر ہے اور ایک مخصوص ومنفرد نثری اسلوب کی وفات حسرت آیات ہے۔ اس عہد کا آخری عظیم نثر نگار رخصت ہوگیا۔ اب خلا ہی خلا ہے، تاریکی ہی تاریکی ہے۔ انتظار حسین کی رحلت پر قاضی صاحب نے فرمایا تھا،'' آخری افسانہ نگار چلا گیا، اب پریم چند، منٹو اور قرۃ العین تو کیا کوئی عبداللہ حسین بھی پیدا نہیں ہوگا''۔ ان کی بات صد فی صد درست تھی اور اب تازہ حقیقت تلخ یہ ہے کہ انتظار حسین کے بعد تو قاضی صاحب کا دم غنیمت تھا، مگر اب کسی قاضی عبدالستار کے منصۂ شہود پر آنے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا۔

قاضی صاحب صرف ادیب نہیں تھے، وہ ادیب ساز تھے، ادیب گر تھے، انہوں نے افسانہ نگاروں کی ایک پوری نسل کی ذہنی وقلمی تربیت کی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج کے اکثر لائق تذکرہ افسانہ نگار، ان کے شاگرد ہیں۔ یہ ایک مثال نادر تھی اور غالباً اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار کہ کسی نثار کے باضابطہ تلامذہ جمع تھے، استاد نے نہ صرف ان کی راہ نمائی کی، بلکہ اصلاح بھی کی۔ پریم چند سے لے کر کرشن، بیدی، عصمت، قاسمی اور منٹو تک اور اس کے بعد قرۃ العین حیدر تک کسی نامور ادیب کے کسی باقاعدہ شاگرد کا واضح سراغ نہیں ملتا۔ یہ افتخار صرف اور صرف قاضی عبدالستار کو ہی حاصل ہوا کہ آج ان کے تلامذہ کی ایک مجسم کہکشاں منور ہے۔ بمقابلہ اردو شاعری، جہاں تلمّذ کی مثال ہر دور میں رہی ہے، نثری تلامذہ کی مثال صرف اور صرف قاضی عبدالستار کے شاگردوں کی شکل میں نظر آتی ہے۔

مضمون ہٰذا خالصتاً تاثراتی نگارش ہے۔ تنقیدی ہرگز نہیں، اس لیے کہ ابھی بے تکلّف تنقید کا وقت نہیں، کہ اس کے لیے فصل درکار ہے۔ تاہم اقتضائے بیان کے تحت قاضی عبدالستار صاحب کی چند نمائندہ تخلیقات کا اجمالی، تعارفی تذکرہ بھی شامل تسطیر کیا جارہا ہے۔

قاضی عبدالستار صاحب نے بہت زیادہ نہیں لکھا، گو بہت کم بھی نہیں لکھا۔ ان کے ناول اور ناولچے کوئی درجن بھر ہوں گے اور افسانے چند درجن، سو سے بھی کم۔ یہاں ان کی تمام تخلیقات کی فہرست سازی مطلوب نہیں، کہ یہ کام تذکرہ نگاروں اور ادبی مؤرخین کا ہے۔ سر دست صرف چند نمایاں تخلیقات کا ذکر ہی بامحل ہے۔

راقم ترقیم کی ذاتی رائے میں ان کا بہترین ناول 'شب گزیدہ' ہے جو جاگیرداری کے آخری دور کی سبق آموز داستان الم ہے، جس میں عہد زمینداری، نیز زمیندارانہ معاشرے کا ایسا زندہ وتابندہ خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس کی مثال نہیں ملتی، تبھی تو قرۃ العین حیدر جیسی مشکل پسند وانا پرست عظیم ادیبہ یہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ 'شب گزیدہ' سے بہتر کہانی صرف قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں'۔ قاضی صاحب کا ناولچہ 'غبار شب' اپنی جگہ بے مثل ہے۔ اس میں آمادۂ رخصت زمینداری، مسلم اقتدار کے زوال اور شکست وریخت سے دوچار ایک ایسے معاشرے کی داستان ہے، جو عبرت انگیز بھی ہے، استعجاب خیز بھی اور خیرہ چشم بھی۔ 'غبار شب' جیسا دھماکہ خیز انجام شاید کم قصّوں کو نصیب ہوا ہوگا۔

ان کا ایک ضخیم ناول 'تاجم سلطان' اپنے خواب ناک ماحول، بے مثل تخلیقی نثر نگاری اور ایک المناک انجام کے لیے لامثال ہے۔ اگرچہ اس کی طوالت بے جواز محسوس ہوتی ہے اور اسی بنا پر ایک طاقت ور ناول آخر میں اپنا اثر کھونے لگتا ہے، تاہم ہنرمند مصنف نے ایک متوقع مگر تہلکہ خیز انجام سے اسے ایک یادگار تخلیق بنا دیا ہے۔ ان کے دیگر ناولوں میں ان کی تخلیق اوّل 'پہلا اور آخری خط' اپنی جگہ اہم ہے۔ البتہ راقم کی نظر میں 'حضرت جان' ان کا سب سے کمزور ناول ہے، نیز اس کی حیثیت علوی نہیں۔

ادبی تاریخ نگاری قاضی عبدالستار کا وصف خاص تھی۔ بلکہ عوامی تاریخی ناول نگاروں کے برعکس انھوں نے بدرجۂ کمال تاریخ کو ادب کا حصہ بنایا۔ اگرچہ ان سے قبل بھی کئی عمدہ تاریخی ناول تصنیف ہوئے، تاہم مسلسل کئی عدد تاریخی ناول صرف قاضی صاحب نے ہی لکھے۔ جن میں

'داراشکوہ'، صلاح الدین ایوبی اور خالد بن ولید شامل ہیں۔ غالبؔ قاضی صاحب کا ایک شاہکار، عمدہ ناول ہے، جسے نیم تاریخی اور نیم داستانوی قرار دیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، قاضی صاحب کے افسانے بہت کم تعداد میں ہیں، اگر چہ زیادہ تر افسانوں کا پس منظر اودھ کے دیہات ہیں اور ان کا موضوع بھی زوال آمادہ، بلکہ زوال شدہ زمینداری ہی ہے۔ تاہم ان کے بیشتر افسانوں میں دیہات کی دگرگوں صورتحال کے علاوہ ایک بڑی سماجی تبدیلی کی آہٹ، بلکہ خبر ملتی ہے۔ ان کا شاہکار افسانہ 'پیتل کا گھنٹہ' ہے، جو بیک وقت ایک مٹتے ہوئے معاشرے کا نوحہ بھی ہے اور ایک بڑی سماجی تبدیلی کا نقیب بھی۔ تفصیل کا محل نہیں، ورنہ صرف اس ایک افسانے پر ایک طول طویل مضمون رقم کیا جاسکتا ہے۔ ان کا دوسرا رومانی دالمیاتی افسانہ 'رضو باجی' ہے، جو مؤثر بیانیے، نیز مستحکم کردار نگاری کی ایک زبردست مثال ہے۔

خیال عام کے برعکس قاضی صاحب کے یہاں محض زمیندارانہ پس منظر ہی نہیں، بلکہ غریب و کمزور دیہی معاشرہ بھی ہے۔ یہاں قاضی صاحب، پریم چند سے یوں مختلف نظر آتے ہیں کہ قاضی صاحب کے یہاں اگر ایک طرف ظلم و استحصال ہے تو دوسری طرف احتجاج، بغاوت، ایک عہد نو کی خبر اور ایک جہد نو کی تصویر بھی، ان کے یہاں دیہی معاشرہ کڑے تیوروں کے ساتھ ایک آنے والے انقلاب کی نوید بھی سناتا ہے۔ یہی قاضی صاحب کی انفرادیت ہے۔

اس مختصر جائزے میں قاضی صاحب کے تمام افسانوں کا تجزیہ ممکن نہیں، لہٰذا ضرورت نگارش کے تحت محض چند اشارے کئے گئے ہیں۔

نظر یہ عام یہ ہے کہ قاضی عبدالستار نے صرف دیہی پس منظر کو ہی موضوع قلم بنایا ہے، لیکن یہ حقیقت نہیں۔ ان کے شہری پس منظر کے چند افسانے بھی اتنے ہی مؤثر ہیں، جن میں بالخصوص 'ماڈل ٹاؤن' لائق ذکر ہے کہ ان کے عام رویّے کے برعکس جدید شہری زندگی کا مرقع پیش کرتا ہے، اور جدید معاشرے کے نئے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔

قاضی صاحب کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے تاریخی افسانے بھی رقم کئے ہیں اور وہ بھی تمام تر ادبی معیارات کے مطابق، نیز تاریخی استناد کی شرط کے ہمرشتہ۔ ان کے نمائندہ تاریخی افسانے 'نیا قانون' اور 'لہو کا عطر' ہیں۔ 'چنگیز خاں کی موت' بھی ایک طاقتور افسانہ ہے، مگر اس میں ایک واقعاتی غلطی در آئی ہے، جس سے اس نگارش تاریخی کی سند مجروح ہوتی ہے۔ مزید تفصیل کا نہ محل ہے، نہ تنگی قرطاس اس کی اجازت بخشتی ہے ورنہ:

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

خلاصۂ کلام کے طور پر راقم یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ قاضی عبدالستار اگر صرف 'داراشکوہ اور شب گزیدہ'، یہی دو ناول اور محض دو افسانے، 'پیتل کا گھنٹہ' اور 'رضو باجی' لکھ کر قلم رکھ دیتے، تب بھی اتنے ہی عظیم ادیب ہوتے۔ کیونکہ یہ چاروں تخلیقات ان کے شاہکار ہیں، نیز اردو ادب کے نئے کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں قاضی عبدالستار کا بے مثل اسلوب اور ان کی شگفتہ و شائستہ نثر ان کے ہمیشہ زندہ رہنے کی ضمانت ہے۔

قاضی عبدالستار صاحب کی زندگی مرزا غالبؔ کے اس شعر سے عبارت تھی:

حسد سزائے کمال سخن ہے، کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کیجے

وہ تا حیات اپنے کمال فن و تخلیقیت بے مثل کے عوض حاسدین و معترضین کا شکار رہے اور انہیں ان کی ادبی مہارت تامہ کی سزا مسلسل ملتی رہی۔ ہمارے ادب عالیہ کے لیے اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوسکتی ہے۔ نیز ہمارے ادبی معاشرے کی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ ایک جائز وفائز ادیب کی منصفانہ قدر افزائی نہ کرسکا۔

ہم قاضی صاحب کے شاگرد رشید نہ سہی، مگر شاگرد عزیز ضرور تھے، نیز، اوّل و سابق کے درجے میں۔ دوران قیام علی گڑھ قاضی صاحب سے ملاقاتیں آئے دن ہوتی تھیں، بلکہ روز ہوتی تھیں، مگر ایک مرتبہ، شاید چند ہفتے گزر گئے اور ہم قاضی صاحب کے درِ دولت پر نہ جاسکے، کچھ تو جھجک اور کم ہمتی اور کچھ دیگر نامعقول اشغال۔ اس وقت تک ہمیں کئی ادبی مقابلوں میں انعامات مل چکے تھے، مگر افسانہ نہیں پڑھا تھا، نہ کسی نے پڑھوایا تھا۔ ہمیں علم ہوا کہ دو دن بعد دانشگاہ کی انجمن ادب (یونیورسٹی لٹریری کلب) میں 'شامِ افسانہ' ہے جس میں انعام بھی ملے گا۔ بس ایک دن گزرا کہ ہم نے اپنے تین عدد افسانے بغل میں دابے اور ایک ادب دوست کی رفاقت میں، قاضی صاحب کے دروازے پر دستک دے دی۔ اگلے دن شامِ افسانہ منعقد ہونے والی تھی۔ قاضی صاحب اپنی روایتی شان سے برآمد ہوئے، بڑی شفقت سے ملے، حسب معمول پُرتکلف چائے پلائی۔ قصہ مختصر، ہم نے انھیں اپنے دو افسانے سنائے، بغیر کسی درمیانی وقفے کے۔ وہ خاموش رہے، پھر ہم نے اپنا تیسرا افسانہ سنایا، جس کا عنوان تھا 'پاگل'۔ ہم نے جب افسانے کی آخری سطریں پڑھیں، جو اس کا نقطۂ عروج بھی تھیں، تب قاضی صاحب نے اپنی مخصوص طویل

'ہونہہ' بھری اور گویا ہوئے:۔''ہاں، یہ ہے، اسی کو پڑھیے اور ضرور پڑھیے''۔ہم ان کا مدعا سمجھ گئے، ہم نے طے کرلیا کہ باقی دو افسانے ہم تلف کردیں گے۔اس کے بعد ہم نے کوئی درجن بھر افسانے لکھے، جو سب ہندوستان اور پاکستان کے معتبر رسائل میں شائع ہوئے، اردو میں بھی اور ہندی میں بھی۔

قاضی صاحب نے ہماری فتح یابی پر شاباشی دی اور مزید ہمت افزائی کی۔تب تک ہم دل ہی دل میں قاضی صاحب کو اپنا استاد تسلیم کرچکے تھے اور اپنی ہر تحریر انھیں دکھانے اور سنانے لگے تھے، ان کی سمع خراشی ہو تو ہو، ہمیں اپنی خودغرضی کے چلتے اس کی پروا نہ تھی۔(قاضی صاحب کی سرپرستی میں ان گنت ادبی کامیابیاں نصیب ہوئیں، جن کی تفصیل سے سردست گریز ہی مناسب ہے)۔اب ہماری ہمت دراز ہوچکی تھی، ہم اکیلے کے ساتھ لوگ آگئے تھے اور کارواں بننے لگا تھا۔پیغام آفاقی سیّد محمد اشرف، طارق چھتاری، ابن کنول، غیاث الرحمٰن، غضنفر، صغیر افراہیم اور مصاعد قدوائی جیسے ہونہار افسانہ نگار اپنا ادبی سفر شروع کرچکے تھے۔یہ سب قاضی صاحب کے شاگرد تھے، ہمارے ہم سفر تھے، رفیق جدوجہد تھے، سب کے ساتھ احبابی رشتہ آج بھی استوار ہے۔قاضی صاحب کی سربراہی میں ہمارا ادبی قافلہ رواں دواں تھا۔ہم میں سے کئی نوجوان، دانشگاہی سطح پر مختلف ادبی انجمنوں کے منصب دار تھے، اس لیے کوئی ادبی جلسہ کرنا اب ہمارے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کا کھیل تھا اور پھر ہماری اپنی ادبی انجمن بھی تھی، جس کے جلسے اکثر و بیشتر اور کبھی کبھی آئے دن بھی ہوتے تھے۔ ہماری ان چھوٹی چھوٹی محفلوں میں بڑے بڑے لوگ آتے تھے، جن میں عصمت چغتائی کے علاوہ خواجہ احمد عباس، حضرت آوارہ، صالحہ عابد حسین، عابد سہیل، سردار جعفری، اختر الایمان، زبیر رضوی، پروفیسر محمد حسن، قمر رئیس اور اصغر وجاہت جیسی ہستیاں شامل تھیں۔مقامی اکابر میں معین احسن جذبی، بشیر بدر، شہریار، جاوید کمال، رویندر بھرمر، کے. پی. سنگھ، اصغر عبّاس اور زیدی جعفر رضا وغیرہ ہمارے سرپرست تھے۔

یادش بخیر، علی گڑھ کے دن بھی کیا دن تھے دور دانشگاہ ہی میں ہماری ادبی ہنگامہ آرائیوں کا نقطۂ عروج ایک دوروزہ کل ہند محاضرہ تھا، جس کا عنوان تھا،''اردو کہانی کے بیس برس''، تیسرے دن محفل افسانہ تھی۔یہ نام کا نہیں بلکہ کام کا کل ہند اجلاس تھا، کیونکہ اس میں علی گڑھ کے علاوہ مرکز میں دہلی سے لے کر مشرق میں لکھنؤ و پٹنہ، وسط میں بھوپال اور دکن میں حیدرآباد تک سے ممتاز ادبا تشریف لائے تھے اور شریک ہوئے تھے۔ مذاکرہ کا افتتاح پروفیسر محمد حسن نے کیا تھا۔مختلف جلسہ ہائے مؤقر کی صدارت، اقبال متین، عابد سہیل، غیاث احمد گدی اور قمر رئیس نے فرمائی تھی۔اس کے ممتاز شرکا میں انور عظیم، اقبال مجید، بلراج مینرا، عقیل رضوی اور علی احمد فاطمی وغیرہم کے علاوہ مقامی سطح پر نمتا سنگھ، نجمہ شہریار، م۔ندیم، اظہار الحسن اور احمد رشید نے بحیثیت افسانہ نگار شرکت کی تھی۔اس تاریخی واردات ادب کے سرپرست قاضی صاحب ہی تھے، ان ہی کے نام پر بڑے بڑے ادیب جمع ہوئے تھے، لیکن ان کی نوازش اور محبت کہ انھوں نے مہتمم، ہمیں مقرر کیا تھا۔اس مذاکرے کی انفرادیت یہ تھی کہ اسے ہم چند قلندروں نے اپنے بل بوتے پر منعقد کیا تھا۔اس کی پشت پر کوئی ادارہ نہ تھا بلکہ کئی ادارے اور بااثر حضرات، اجتماعی طور پر اس کو ناکام کرنے کے لیے شب و روز سرگرداں تھے۔بہرحال مذاکرہ ہوا اور خوب ہوا۔یہ سمینار علی گڑھ کی ادبی تاریخ میں آج بھی یادگار ہے کیونکہ یہ عوامی پروگرام تھا، سرکاری نہیں۔علی گڑھ میں ہم نے اتنی ادبی محفلیں منعقد کیں کہ انھیں بے شمار ہی کہا جائے گا۔بڑے بڑے قدآور ادیب و شاعر شریک ہوئے، بیرونی بھی اور مقامی بھی اور مقامی بھی وہ جن کا ایک مقام تھا۔قاضی صاحب ہر موقع پر، ہر مرحلہ پر ہمارے راہنما تھے۔رہبر بھی اور رفیق اکبر بھی۔

علی گڑھ میں بھی اور علی گڑھ سے باہر بھی، متعدد ادبی مجالس میں ہمیں قاضی صاحب کے ہمرکاب ہونے کا شرف حاصل رہا۔بھوپال میں آل انڈیا ریڈیو کی شامِ افسانہ ہو یا مدھیہ پردیش ساہتیہ اکادمی کا مذاکرہ، جس میں قاضی صاحب نے 'وقت' کے موضوع پر بے مثل تقریر کی تھی۔ اس جلسے میں ہندی کے مشہور ادیب اشوک باجپئی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔یاد آتا ہے کہ اس یادگار بزم میں کوثر چاند پوری اور قمر احسن بھی تھے۔لکھنؤ میں ترقی پسند ادب پر مذاکرہ تھا، ہم نے نئے افسانے پر مضمون پڑھا، میر محفل سردار جعفری تھے، مہمانِ خصوصی حسن کمال۔مختلف جلسوں کی صدارت، پروفیسر محمد حسن، قمر رئیس اور قاضی عبدالستار نے کی۔اس کے علاوہ، وہاب اشرفی، اظہار اثر، عتیق اللہ اور کوئی درجن بھر قلم کار شریک تھے۔ہمارے تیکھے مضمون کو اکابر و اصاغر، سب نے انگیز کیا اور ہم نے اسے اپنی سرفرازی پر محمول کرلیا۔

اسی طرح الٰہ آباد میں ایک سمینار میں ہم نے قاضی صاحب کی معیت میں شرکت کی۔ہم نے اقبال پر ایک مقالہ پڑھا، جس پر قمر رئیس نے بڑا یادگار جملہ ارشاد کیا، انھوں نے فرمایا،''اس مضمون کے بعد میرے مضمون کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ میرے مضمون کے بیشتر نکات ان کے مضمون میں آچکے ہیں، تاہم میں نے مضمون لکھا ہے اس لیے

پڑھوں گا۔'' ظاہر ہے کہ یہ قمر رئیس کی عظمت تھی، ورنہ کوئی اور ہوتا تو اس سے یہ جملہ ہرگز ہرگز سرزد نہ ہوتا، سچ ہوتا تب بھی نہیں۔ خیر ہم نے ان کی بات کو پورا سچ تو نہیں مانا کہ اس میں کچھ محبت اور شفقت بھی یقیناً شامل تھی۔ بہرحال وہ لمحہ ہمارے لیے یادگار تھا۔ جلسے کے بعد عابد سہیل اور عقیل رضوی نے بھی ہماری پیٹھ ٹھوکی، اس جلسے میں قاضی صاحب نے ادب و شاعری کے تاریخی تناظر اور بالخصوص اقبال کے حوالے سے ایک شعلہ بار، مگر فکر انگیز تقریر کی، غالباً خطبۂ صدارت تھا، جس پر عش عش تو سب نے کیا، لیکن وہاں موجود مولانا شاہد فاخری کے پسر ناصر فاخری تو جیسے قاضی صاحب کے دیوانے ہوگئے، اس کے بعد قاضی صاحب کے طفیل، اگلے کئی دن تک ہم سب کی آؤ بھگت ہوتی رہی۔ ہمارے دوست علی احمد فاطمی، اس سمینار کے منصرم تھے۔ ایک مرتبہ فاطمی نے الٰہ آباد میں افسانے پر ایک زبردست مذاکرہ اور محفلِ افسانہ منعقد کی، جس کے مہمانِ خصوصی انتظار حسین تھے، پروفیسر محمد حسن اور کلام حیدری بھی تشریف لائے تھے۔ اس محفل میں ہمارے ہمراہ علی گڑھ سے سیّد محمد اشرف اور طارق چھتاری گئے تھے اس کے علاوہ سلام بن رزاق، انور قمر اور عبدالصمد سمیت کئی اور افسانہ نگار تھے جن میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ قاضی صاحب کا افسانہ تو حاصلِ محفل تھا ہی، اشرف اور طارق کے افسانے بہت خوب تھے، ہم نے بھی ایک افسانہ پڑھا اور اگلے دن ایک مختصر کہانی، زبانی سنائی جس کی تعریف احمد ہمیش جیسے جدیدیت پسند نے، بے اختیار کی۔ اسی اجلاس میں بلونت سنگھ، اُپندر ناتھ اشک اور پریم چند کے فرزند امرت رائے سے ملاقاتیں ہوئیں۔ الٰہ آباد میں ایک پروگرام افسانے کا اور بھی ہوا تھا۔ جس کی تفصیل اب یاد نہیں۔

علی گڑھ کی ادبی محفلوں کے ذیل میں ایک واقعہ اور شیخ الجامعہ علی محمد خسرو صاحب کی شریکِ حیات طیبہ خسرو بڑی ادب نواز تھیں، وہ خود بھی کہانیاں لکھتی تھیں، ہم پر مہربان تھیں اور قاضی صاحب کی زبردست مداح۔ وہ ہماری دلداری اور ہمت افزائی کے لیے ہماری چھوٹی چھوٹی محفلوں میں رونق افروز ہوا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی رہائش گاہ، یعنی قصر شیخ الجامعہ میں ایک شعری نشست منعقد کی، جس میں اس عہد کے تمام مقامی اکابرین، بشمول جذبی شریک تھے۔ ہر چند کہ موقع نہیں تھا، مگر وہ مصر ہوئیں کہ قاضی صاحب افسانہ سنائیں۔ قاضی صاحب افسانہ لائے ہی نہیں تھے، اس دلیل کو ناکام کرنے کے لیے طیبہ خسرو نے قاضی صاحب کا ایک ناول انھیں پیش کر دیا، جس کے چند صفحات انھیں سناتے ہی بنی۔ طیبہ آپا نے ہماری بڑی سرپرستی کی، ان کی کرم فرمائیاں ہمیں اب بھی یاد ہیں۔ ہم خسرو صاحب کے دربار میں تو وقت ناوقت باریاب تھے ہی، مگر طیبہ آپا کی عنایات خسروانہ، جناب خسرو کے حساب میں نہ تھیں، وہ سیاسی معاملات تھے اور یہ خالصتاً ادبی۔

اپنے احباب دیرینہ میں قاضی صاحب سب سے زیادہ ذکر اپنے قریب ترین دوست، کنور پال سنگھ (کے۔ پی سنگھ) کا کرتے تھے، جن کے بارے میں ان کا یہ جملہ مشہور تھا کہ ''میری نظر میں علی گڑھ کا سب سے خوبصورت آدمی کے۔ پی سنگھ ہے''، باور ہو کہ موصوف، سرتاپا سیاہ فام تھے، مگر قاضی صاحب کی نظر میں گل فام۔ جہاں تک خردوں کا سوال ہے، تو ان کے تئیں قاضی صاحب کی محبت و شفقت اور ان کا لحاظ، کہیں بخل کا شکار نظر نہیں آتا تھا۔ قاضی صاحب یوں تو بڑے نازک مزاج اور بڑے ٹھسّے والی ہستی تھے، لیکن خیال خاطر احباب کے تحت اکثر وہ اپنے مزاج اور معیار سے سمجھوتہ بھی کر لیتے تھے، اس ضمن میں ہمارے تجربات ان گنت ہیں۔

یہاں ایک الزام عائد ہوسکتا ہے کہ قاضی مرحوم کی آڑ میں ہم اپنی داستان سنا رہے ہیں، لیکن یقین جانئے کہ مانگے کے اجالے سے اپنا چہرہ روشن کرنے کی ہماری کوئی نیت نہیں۔ دراصل گزشتہ پچاس برس کے عرصے میں ہم قاضی صاحب کی داستان کے ایک کردار سرگرم رہے ہیں اور ہماری کہانی بھی اگر کبھی کہی جائے گی تو قاضی صاحب اس میں سب سے بلند قد اور حاوی کردار ہوں گے۔ افسوس یہ ہے کہ مرحوم اپنے شاگردوں کا ایک تذکرہ لکھ رہے تھے، مگر ان کی ناگہانی موت کے سبب وہ ناتمام یا شاید بے آغاز ہی رہ گیا، ورنہ کئی پوشیدہ باب وا ہوتے۔ کتنوں کی رونمائی اور کتنوں کی بے نقابی ہوتی۔

قاضی صاحب کے ساتھ کئی ادبی ناانصافیاں ہوئیں۔ گو کہ انھیں گیان پیٹھ کے علاوہ ہندوستان میں کسی بھی ادیب کو مل سکنے والے تقریباً تمام انعامات اور اعزازات مل چکے تھے، ماسوا ساہتیہ اکادمی انعام کے۔ وہ عرصۂ دراز تک ساہتیہ اکادمی کے جج رہے تھے، ساہتیہ اکادمی نے ان کے فن کی عظمت کا اعتراف بھی کئی مرتبہ کیا تھا، لیکن یہ گراں قدر انعام جوان کے شاگردوں کو مل چکا تھا، اس کے علاوہ ان سے کہیں کم تر، غیر اہم اور غیر معروف لوگوں کو بھی مل چکا تھا، اپنی بے وقعتی کی حد تک، مگر قاضی صاحب کو نہیں ملا۔ ہر چند کہ قاضی صاحب جس مقام پر تھے وہاں وہ ان تمام تر انعامات و اعزازات سے بالا تر تھے۔ ساہتیہ اکادمی ہی کیوں قاضی صاحب 'گیان پیٹھ' انعام تک کے سزاوار تھے۔ ویسے تو قاضی صاحب کا سب سے بڑا اعزاز اور سب سے بڑی سرفرازی یہ تھی کہ ہندوستان گیر سطح

پران کے درجنوں شاگرد پروفیسر وصدور شعبہ تھے اور ہیں، شاید کئی ایک شیخ الجامعہ بھی ہوں اور جو اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں۔

ہمیں قاضی صاحب سے چند شکایتیں بھی تھیں۔ انھوں نے بااثر، بارسوخ اور بااختیار ہونے کے باوصف کبھی، ازخود ہمارے مستقبل کی تعمیر میں دلچسپی نہیں لی، علی گڑھ جیسے کوفہ صفت معاشرے میں ہم نے ان کی ہم نوائی کی، معاونت کی اور اپنے ترقیاتی امکانات کی قیمت پر کی۔ ان کا مخالف خیمہ برسر اقتدار تھا، اور ہم ان کے خیمے میں تھے، ہمیشہ رہے جب کہ ہمارے کئی احباب (اوران کے رفقا) نے یا تو دوغلا رویّہ اپنایا یا پھر پالا بدل لیا، نتیجتاً، آج وہ (دنیاوی طور پر) کامیاب اور سرخ رو ہیں، جب کہ ہم نے وفاداری بشرط استواری کو جزو ایمان بنائے رکھا، وضع داری و پاسداری کو ہر جنبش اور لرزش سے محفوظ رکھا اور کبھی پائے استقامت کو لغزش نہیں ہونے دی۔ ہر ظلم کو بسر وچشم برداشت کیا۔ قاضی صاحب کا دور اقتدار بھی آیا تھا اور وہ کچھ ایسا مختصر بھی نہ تھا، بلکہ ایک زمانے میں، عصری شیخ الجامعہ ان کے مداح نہیں، بلکہ مرید تھے، وہ جو کہتے، وہ ہوسکتا تھا اور ہوتا تھا۔ اسی پر بس نہیں، کم از کم ایک دوعشرے پر محیط عرصے میں اُردو ہی نہیں ہندی ادب میں بھی ان کی عمل داری تھی، ریڈیو اور ٹی وی، ان کی جیب میں تھے۔ ترقی وتنزّلی تو خدائے بزرگ و برتر کے اختیار کلّی میں ہے۔ ضروری نہیں کہ قاضی صاحب ہماری مدد ونصرت میں کامیاب ہی ہوتے۔ گلہ تو یہ ہے کہ انہوں نے نہ کوئی دلچسپی لی نہ استفسار حال کیا۔ اگرچہ ہم ان کی بے نیازی و بے خبری پر مکمل ایقان رکھتے ہیں اور یہ باور کئے لیتے ہیں کہ انہوں نے قصداً بے توجہی نہیں فرمائی، ان سے فروگزاشت ہی ہوئی ہوگی۔ بہرکیف وقت گزر گیا، مگر شاخ نہال غم ہری ہے اور شاید رہے گی۔

ہم نے قاضی صاحب کے ناول 'داراشکوہ' پر ایک مضمون، بزبانِ فرنگ پیش کیا ہے۔ اور دبے لفظوں میں اپنے اس انقلابی عزم کا انکشاف بھی کردیا ہے کہ ہم اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے، بلکہ شروع بھی کردیا ہے۔ ہماری محدود معلومات کے مطابق قاضی صاحب کے فنِ تحریر پر انگریزی میں یہ پہلا مضمون ہے۔

ابھی کل تک اردو کے سب سے قدآور ادیب، قاضی عبدالستار تھے جو پچاسی چھیاسی برس کی عمر میں بھی جوان ہوں نہ ہوں، رواں دواں تھے، ہم سے کہیں زیادہ مستعد تھے۔ وہ بابر کے قول پر یقین رکھتے ہوئے زندگی کو بھرپور انداز سے جیتے تھے، کیونکہ یہ ایک بار ہی ملتی ہے۔ قاضی صاحب کے مزاج کا خاصّہ یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ سب کچھ اُن کی مرضی کے عین مطابق ہو اور اُن کے کہے بغیر ہو، ظاہر ہے کہ عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ اس بات کا اعتراف اُنھیں خود بھی تھا، مگر مزاج تو مزاج ہے، وہ کیسے منقلب ہو؟

عہد حاضر کے تمام کبائر ادب، یکے بعد دگر مائل بہ رخصت ہیں، اقبال متین اور غیاث احمد گدّی کب کے راہیٔ طارم ہوئے۔ انور عظیم بھی گئے اور عابد سہیل بھی اور تاحال انتظار حسین کے بعد قدآور افسانوی ادبا میں صرف اور صرف قاضی عبدالستار، منظر ادب پر جلوہ گر تھے۔ اگر ان کا قلم آمادۂ صریر رہتا تو افسانوی ادب مزید ثروت مند ہوسکتا تھا۔ ان کا دم غنیمت تھا، پرانے بادہ کشوں میں بس اب وہی وہ تھے، مگر، حیف کہ وہ بھی راہیٔ امصار افلاک ہوئے:

موت سے کس کو رستگاری ہے

فراقؔ نے کہا تھا کہ آنے والی نسلیں ان کے ہم عصروں کو قابل فخر خیال کریں گی کہ انہوں نے فراقؔ کو دیکھا تھا۔ ہمیں بھی اپنے اس فخر پر فخر ہے کہ ہم نے قاضی صاحب کو نہ صرف دیکھا، برتا، بلکہ ہم ان کی بارگاہِ علم و ادب کے ثمر یافتہ ہیں، یہ فخر نہیں، افتخار ہے۔ ہماری نظر میں قاضیؔ صاحب، بہ اوصاف مخصوص، نیز، اپنی بشری کمزوریوں کے باوصف واحد تھے، وحید تھے، یکتا تھے، شاید اپنی تمثیل وہ خود تھے۔ کیونکہ ان کی شخصیت میں جو کجی تھی، جو ادائے بے نیازی تھی، وہ بھی اپنی مثال آپ تھی، مگر ان کی شخصیت بقول حالیؔ کچھ یوں تھی۔

خاکساروں سے خاکساری تھی، سربلندوں سے انکسار نہ تھا۔

آج قاضی عبدالستار صاحب ہمارے درمیان نہیں، مگر مادّی طور پر نہ سہی، ذہنی وتصوراتی سطح پر وہ آج بھی نہ صرف موجود ہیں، بلکہ مؤثر ہیں، ان کی تخلیقات وتصنیفات اس امر کی شاہد ہیں اور ہمارے لیے تو وہ زندہ تھے، زندہ ہیں، زندہ رہیں گے، تابندہ رہیں گے:

قاضی وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے

اتمام گفتگو کے طور پر، خدائے سخن میر تقی میر کا ایک شعر درج کرنا لازم ہے، جو قاضی صاحب مرحوم کا پسندیدہ شعر تھا۔ وہ اسے اکثر پڑھتے اور سر دھنتے تھے۔ اس سیاہ بخت نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن یہی شعر ان کی یاد میں مندرج کرنا اس کی مجبوری ہوگی۔ بہرکیف شعر حاضر ہے:

جب نام ترا لیجے، تب آنکھ بھر آوے
اس زندگی کرنے کو، کہاں سے جگر آوے

◆◆◆